ڈاکٹر حمیرا اشفاق
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

خالد فتح محمد کے ناول اے عشق بلا خیز کا تجزیاتی مطالعہ

Khalid Fateh Muhammad's Urdu novel Ishq-i-Bilahaiz is a new creative contribution regarding partition of 1947. This novel does not directly deal with the incidents that occurred around partition but it covers the impact and consequences of partition of the sub-continent Indo-Pak into two independent and sovereign states. It is the story of two communities, local and immigrants from India, dealing with the issue of assimilation. It is a narrative of friction between local Punjabi and migrant Urdu speaking populations. Khalid Fateh Muhammad has tried to further probe the different attitudes of older and younger generations from both the communities. The members of older generations are not ready to assimilate with each other while an Urdu speaking boy and a Punjabi girl discuss everything and fall in love breaking the frontiers ethnic biases. This article offers a post-partition analysis of the novel.

خالد فتح محمد اردو ناول نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں ان کا فنی وفکری سفر اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ جاری ہے۔ ان کی کئی ادبی جہات ہیں جن میں ناول نگاری بلا شبہ ان کا بنیادی حوالہ ہے۔ وہ ایک نظریاتی ادیب ہیں جو دنیا کے لیے، ذات پات اور طبقاتی تفریق سے ہٹ کر ایک ایسا جہاں تعمیر کرتے نظر آتے ہیں جس میں مساوات اور محبت کا رنگ غالب ہو۔ ناول نگار کا عصری، تہذیبی اور تاریخی شعور ان کے موضوعات، کردار اور اسلوب کو ایک ایسی انفرادیت عطا کرتا ہے، جس سے اردو ناول کی روایت میں توانائی اور تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کے تمام ناولوں کے موضوعات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ موضوعاتی رنگا رنگی اور تنوع، مصنف کے ذہنی اور فکری رویوں کی وسعت کی بھی دلیل ہے۔

اے عشق بلا خیز جیسا کہ موضوع سے بھی ظاہر ہے اپنے اندر عشق اور بالخصوص کچی عمروں کی لغزشوں کی داستان ہونے کے ساتھ ساتھ ''عشق'' جیسے لافانی جذبے کی داستان بھی بیان کرتا ہے۔ لیکن ناول نگار نے عشق کو عام آدمی کی دسترس سے دور کوئی متبرک شے بنا کر غلافوں میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا۔ ناول کے کردار اپنے اندر اتنے سادہ اور عام

ہیں کہ ان کے درمیان پروان چڑھنے والا جذبہ عشق اپنی پوری جولانیوں کے باوجود سادہ اور عام اظہاریہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ناول نگار نے کہیں بھی عشق اور جسم کے درمیان ہونے والی کشاکش کو کسی الہامی جامے میں ملفوف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بل کہ کہانی میں کئی مقامات پر عشق اپنی تکمیل کسی معروض کی شکل میں چاہتا ہے۔

''وہ وہاں موجود نہیں تھی لیکن مجھے لگ رہی تھی۔ کیا موجود ہونا، نا موجود ہونا تھا یا ناموجود ہوتے ہوئے موجود ہوا جا سکتا ہے۔! میں کیا چاہتا تھا؟ یہی کہ وہ موجود رہے اور وہ موجود نہیں تھی۔ لیکن موجود نہ ہوتے ہوئے بھی موجود ہوا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ بوجھل تھی میں اس کی موجودگی کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے کمرے میں آتے ہی ایک عجیب بوجھل پن کا احساس ہوا۔'' (۱)

ناول کا سادہ قاری شاید اس ''عشق بلاخیز'' کے کچے پکے، اور نیچے نیچے، جذباتی اور لمحاتی تلذذ کی کشمکش میں کھو جائے لیکن ناول کا بنظرِ غور مطالعہ کرنے سے اس کے کرداروں کے اردگرد پھیلی فضا اور اس میں دو تہذیبوں کے ٹکراؤ داستان سنائی دینے لگتی ہے۔ یہی تہذیبی اور ثقافتی بُعد ایک تصادم کی شکل اختیار کر کے کہانی کا مرکزی موضوع بن کر ابھرتا ہے۔ کہانی کا پلاٹ دو خاندانوں کے گرد گھومتا ہے، جس میں ایک ٹھیٹھ پنجابی اور دوسرا مراد آباد سے ہجرت کر کے گوجرانوالہ پہنچنے والا مہاجر خاندان ہے۔ اس ناول میں ہجرت کا موضوع ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہونے والے الاٹمنٹس کے مسائل کو بھی بالواسطہ سامنے لاتا ہے۔ لیکن بڑی آسانی سے ناول نگار ہجرت کی تباہ کاریوں، تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے مہاجرین کیمپوں کے مسائل یا دیگر اس کے متعلقہ موضوعات سے قدرے گریز کرتے ہوئے براہ راست ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کو موضوع بناتے ہیں۔ تقسیم کے بارے میں لکھا گیا ادب شاید اس غیر جانبداری کا متحمل نہ ہو سکتا تھا جسے خالد فتح محمد نے کمال مہارت سے پیش کیا ہے۔ جس میں کسی قسم کی خونی داستان کا ذکر تک نہیں کیا گیا اور نہ ہی مہاجرین کے ذکر کے ساتھ ساتھ لسانی اور ثقافتی تفوق کو نمایاں کر کے ماضی کے مزار تعمیر کیے گئے ہیں۔

گوجرانوالہ میں مقیم ہونے والا یہ مہاجر خاندان اپنے تہذیبی ورثے کو ہر صورت بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے افراد زیادہ میل جول سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ بس کبھی کبھار کسی ایک کے گھر میں مہینے دو مہینے میں اکٹھے ہو کر پرانی یادوں کو چھوٹے سے گھریلو طرز کے مشاعرے میں تبدیل کر لیا کرتے تھے یہ بھی ایک طرح کے فرار کی صورت کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ باہر کی دنیا ان کے مزاجوں سے یکسر متضاد ہے مصنف نے اس ساری صورتحال کا تجزیہ کچھ اس انداز میں کیا ہے۔

''ہمارے اردگرد کے لوگ ہمیں اتنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم بھی انہیں پسند نہ کرتے

ہوں۔ ہمارے جیسے خاندانوں کا تعلق یا تو ان علاقوں سے تھا جہاں سے ہم آئے تھے اور یا ہم سب کی کوشش رہتی کہ کراچی چلے جائیں۔اماں جان نے ساڑھی پہننا تو چھوڑ دی تھی لیکن ان کا ملنا جلنا کسی بھی پنجابی عورت کے ساتھ نہیں تھا۔ اس میں شاید زبان بھی ایک رکاوٹ ہو لیکن ابا کو ایسا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔لیکن انہیں پنجابی بولنے والوں کے ساتھ ضرورت کے علاوہ کوئی ربط رکھنا پسند نہیں تھا۔ہمیں بھی روکتے کہ ہم اپنی زبان اور لہجے کی حفاظت کریں'' (۲)

جہاں تک پنجابی خاندان کے سر براہ خواجہ صاحب کا تعلق ہے وہ جب اس مہاجر خاندان کو کھانے پر بھی بلانا چاہتے تو مؤخر الذکر کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

خواجہ محبوب کے دعوت دے کر چلے جانے کے بعد میاں بیوی کے درمیان ہونے والے مکالمے مندرجہ بالاصورت حال کی وضاحت کریں گے۔

''تم اپنی تہذیب اور تمدن کو کہاں تک بچاؤ گے؟ ہمارے پڑوسی دعوت دے رہے ہیں اور نہ جانا انتہائی بد اخلاقی ہے۔کل انہوں نے ہی ہماری مشکل میں کام آنا ہے۔تم نہیں جانا چاہتے مت جاؤ، میں تو جاؤں گی۔''

ابا مجھے کچھ کھچاؤ میں لگے۔

''پہلی بات کہ مجھے خواجہ صاحب کا دعوت دینے کا انداز پسند نہیں آیا''

''وہ چڑیا گھر سے ہاتھی منگوا کے اس پر سوار آتا۔'' (۳)

ناول نگار کا تہذیبوں کے تصادم میں اردو دان طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود پنجاب کے تہذیبی رچاؤ میں دلچسپی لینا ہی دراصل اسے ناول کی ہیروئین ''نوید'' کی طرف بھی متوجہ کر دیتا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''نوید'' کی کشش ہی مصنف کو اس تہذیب سے لگاؤ کا سبب بن رہی ہو۔

لیکن اس موضوع کو انتہائی لطیف پیرائے میں بیان کرتے چلے جانا ناول نگار کی کہانی پر گرفت کی دلیل ہے۔

''گلی میں ہمارے گھر دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتے تھے۔خواجہ محبوب پنجابی تھے اور ان کے رہن سہن میں پنجاب رچا بسا ہوا تھا۔مرد گھر کے اندر دھوتی میں ہوتے، اونچی آواز میں گفتگو کرتے اور ان کے بلند قہقہوں کی گونج میں سے ٹپکتی مٹھاس میں بالکونی میں بیٹھا ہوا بھی محسوس کر سکتا تھا۔۔۔ہم لوگ تو

ایک تکلف کے دریچے میں کھڑے ایسی زندگی گزار رہے تھے جو ان سے بالکل مختلف تھی۔۔۔اس تنگ سی گلی میں دو تہذیبیں سانس لیتی تھیں! (۴)

تہذیبوں کے اس ٹکراؤ میں زبان بھی ایک مسئلہ بن کر ابھرتی ہے جسے ناول نگار نے کئی حیلوں سے دو متضاد آراء کو متوازن کرنے کی کوشش کی ہے۔

''ہمارے تعلقات اچھے نہیں، خواجہ محبوب ہماری زبان کی وجہ سے ہمیں ملنے سے کتراتا تھا'' (۵)

اس جملے میں پنجابی بولنے والوں کی اردو دان طبقے سے مرعوبیت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔لیکن دوسری طرف سے زبان کو ایک جامد شے سمجھتے ہوئے کئی طرح کے صندوقوں میں بند کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ تا کہ اس میں کسی دوسری زبان کا کوئی لہجہ یا لفظ داخل ہو کر اسے خراب نہ کر دے۔ یہ رویہ اردو دان طبقے کو میل جول سے روکے ہوئے تھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک تشکیک کا پہلو پنجابی بولنے والوں کی طرف سے بھی موجود تھا۔

''وہ جب کبھی گلی میں ملتا تو ایک انوکھی قسم کی بے اعتنائی کے ساتھ جس میں محبت اور خلوص کے ساتھ شک کا ایک پہلو بھی نظر آتا۔ اسے میرے بہاری مہاجر ہونے کی وجہ سے کوئی علاقائی شک تھا یا میرا پنجابی طور طریقہ شبے میں مبتلا کر دیتا۔(۶)

''نوشہرہ روڈ پر رہتے ہوئے میرا خاندان ایک عجیب قسم کی صورت حال سے دوچار تھا۔ ہمارے اردگرد کے لوگ ہمیں اتنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم بھی انہیں پسند نہ کرتے ہوں۔۔'' (۷)

''اماں جان نے ساڑھی پہننا تو چھوڑ دیا تھا لیکن ان کا ملنا جلنا کسی بھی پنجابی عورت کے ساتھ نہیں تھا۔ اس میں شاید زبان بھی ایک رکاوٹ ہو لیکن ابا کو ایسا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔۔۔

وہ اردو زدہ پنجابی بھی بول لیتے تھے۔لیکن انہیں پنجابی بولنے والوں کے ساتھ ضرورت کے علاوہ کوئی ربط رکھنا پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیں بھی روکتے کہ ہم اپنی زبان اور لہجے کی حفاظت کریں۔(۸)

بشیر علی خان جو مہاجر اردو دان طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ اپنے بیٹے یعنی ناول کے مرکزی کردار وصی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''دیکھو میاں! عموماً وہ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے تھے،''زبان ہر تہذیب کی پاسبان ہوتی ہے۔ مراد آباد سے یہاں آباد ہونے کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ اپنی زبان یا اس کے لہجے یا تلفظ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا

جائے۔سکھ دور میں کابل منتقل ہونے والے سکھ وہاں آج بھی پنجابی ہی بولتے ہیں۔ ہم نے تو چند سالوں میں ہی خود کو بدل لیا۔۔ انہوں نے یہ بھی بتانا تھا کہ ۱۸۸۱ء تک اور بعد میں اردو زبان کو نچلے درجے پر دھکیلنے اور ہندی کو بلندی دینے میں کتنی ناانصافیاں ہوئیں۔ یہ بھی ہمیشہ سمجھاتے کہ ہم نے اس علاقے میں اقلیت میں رہتے ہوئے اکثریت پر غلبہ پانا ہے۔جس کے لئے اپنے تمدن کی حفاظت از حد ضروری ہے۔(۹)

لباس،طرز طعام وقیام جوان دوتہذیبوں کے درمیان کشاکش کی فضا کوجنم دینے کا سبب تھا وہیں یہ اجنبیت کسی رومانس یا کشش کا سبب بھی بن رہی تھی۔

''ابا۔۔۔ آپ مقامی لباس پہننا شروع کریں۔ اماں جان تو ساڑھی ترک کر کے شلوار قمیص پہننے لگی ہیں۔آپ کبھی کبھار تہہ بند میں سج جایا کریں۔۔۔ میں ان کے طنز کی یلغار کا منتظر ہو گیا۔۔''اور اگر یہ سالی نیچے کھسک گئی تو اسے اٹھائے گا کون؟ میں تو نہیں جھکوں گا!''

پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔''میاں! یہ ہمارا لباس نہیں ہم تو وہی پہنیں گے جو صدیوں سے پہنتے چلے آئے ہیں۔ مجھے تو تمھارا یہ رام لیلا کھیلنا پسند نہیں'' ان کی آواز میں دکھ اور تھکاوٹ تھی۔ مجھے تھکاوٹ میں شکست نظر آئی۔''(۱۰)

زبانوں کی اس بحث کے ساتھ ایک بات جوایعشق بلا خیز کوغیر معمولی بناتی ہے۔وہ ناول نگار کی تخلیقی زبان اور کرداروں کے طبقات،عمر اور جذبات کو بعینہٖ اختیار کرنا ہے۔جس سے کرداروں کے درمیان بولے جانے والے مکالمے انہیں اپنی اپنی تہذیب کا نمائندہ بناتے ہیں۔

ذیل میں ایک نمونہ درج ہے:

''ہم جب بیٹھے تو ابا اپنی کرسی پر اونگھ میں چلے گئے تھے اور برتنوں کی کھٹ کھٹ، پیروں کی گھسڑ گھسڑ، باتوں کی چڑ چڑ سے چونک کر جاگے۔''(۱۱)

''میری یونیورسٹی پرانی ہے اس کا نظام برصغیر میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

تمہارے ابا نے جو کھڑی کی تھی! اماں جان نے ہم دونوں کو ایک ہی وار میں نشانہ بنایا اور ہنسنے لگیں۔''(۱۲)

کرداروں کی نفسیات ان کی الجھنیں اور خوشیاں سب ان کے ماحول اور ماضی سے وابستہ دکھائی دیتی ہیں۔ خواجہ محبوب اپنے روز وشب میں گم اور مولوی بشیر احمد اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں نئی نسل یعنی ''نوید'' اور وصی) '' دونوں اپنی امنگوں اور خواہشوں کے انبار تلے دبے گردوپیش سے بے خبر صرف نئے جہان کے متمنی تھے جس میں ان کی تکمیل کا کوئی مرحلہ طے ہو سکے۔ یہ دونوں مرکزی کردار ایک دوسرے کے تہذیبی رویوں کو بھی پسندیدگی اور اشتیاق سے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اس تہذیبی رچاؤ میں ایک طرح کا تلذذ اور کشش بھی محسوس کرتے ہیں۔

ناول کے مرکزی کردار ''نوید'' اور ''وصی'' اپنے اپنے خاندانوں اور تہذیبوں کا حصہ ہونے کے باوجود اپنے لئے ایک الگ گوشہء عافیت تلاش کرتے ہیں اور خود اپنے آپ میں ہجوم کا حصہ ہونے کے باوجود تنہا بھی دکھائی دیتے ہیں۔ پنجابی گھروں کے اندر زندگی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔لیکن نوید ایک مقام پر اپنی تنہائی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے۔

> ''تھکاوٹ نہیں، تنہائی ہے'' اس نے ایک طرح بشاشت سے کہا ''تمہارے گھر میں تو ہر وقت شور رہتا ہے۔ ایسے ہنگاموں میں تنہا کیسے ہوسکتی ہو؟ ''مجھے تم نے تنہا کر دیا ہے'' (۱۳)

اس پیرائے میں تنہائی کو ایک اور زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔

> ''تنہائی کئی قسم کی ہوتی ہے''۔ پھر وہ خاموش ہوگئی مجھے لگا کہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہے۔''ایک وہ تنہائی جس سے تم گزر رہے ہو، ایک وہ جس میں میں مبتلا ہوں ایک وہ جو انسان خود پیدا کرتا ہے۔۔۔۔ میری تنہائی کی وجہ یہ ہے (۱۴)

ناول نگار تنہائی سے پیوست کئی طرح کے سوالات کے فلسیانہ جوابات بھی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جو ناول کے متن میں س طرح متصل ہیں کہ قاری ہر بحث کے نئے دروازے کھول کر کہانی سے دور نہیں ہوتے بلکہ کرداروں کے باطن کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

> ''موجود ہو؟'' میں نے پھر وہی گردان کی لیکن مجھے جواب نہیں آیا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی لیکن مجھے موجود لگ رہی تھی۔ کیا موجود ہونا، نا موجود ہونا تھا یا نا موجود ہوتے ہوئے موجود ہوا جا سکتا ہے! میں کیا چاہتا تھا؟ یہی کہ وہ موجود رہے اور وہ موجود نہیں تھی لیکن موجود نہ ہوتے ہوئے بھی موجود ہوا جا سکتا ہے۔ اس لیئے وہ موجود تھی۔ میں اس کی موجودگی کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گیا (۱۵)

خواب اور حقیقت کے درمیان معلق رشتوں کو ''نوید'' اپنے انداز میں دیکھتے ہوئے کہتی ہے:

''میں تمہیں اپنے خواب سناؤں گی۔ میں نے ہمیشہ بہت خوبصورت خواب دیکھے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ رات کے دیکھے خواب دن کو الٹ جاتے ہیں۔ شاید میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔'' اب میں نے دن کو خواب دیکھا کرنے ہیں۔''''دن کے دیکھے خواب کیا رات کو الٹ نہیں ہو جاتے۔'' دن کے تو خواب ہوتے ہی نہیں۔ دن میں سچ ہوتا ہے۔ لوک شادی بھی اسی لئے دن کو کرتے ہیں۔(۱۶)

ناول میں سانپ کا بار بار ذکر آتا ہے۔ سانپ کی علامت عمومی طور پر زرخیزی اور زندگی کے احیاء سے جڑی ہوئی ہے۔ نارتھ امریکہ میں سانپ زندگی کی تخلیقی قوت، زرخیزی اور نمو کو سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ مصر میں لافانیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پورے ناول میں بیلوں میں رینگتے سانپوں کا ذکر بار بار ملتا ہے ایک ہندوستانی اسطورہ کے طور پر بھی سانپوں کا بیلوں میں موجود ہونا اور پھر سو سال کے بعد انسانی روپ دھار لینا جیسی کہانیاں موجود ہیں۔ لیکن نوید اور وصی کے کردار میں زندگی کی از سرِ نو تخلیق، یا تخلیقی عمل کی طرف مراجعت کے ذیل میں یہ علامت بالکل مناسب معلوم ہوتی ہے۔

''سانپ کو انسان کا دشمن کہا جاتا ہے اور انسانی زندگی میں متعدد علامتیں اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ ٹہنی کے ساتھ لپٹا ہوا کسی رسّی کی طرح زندہ لگ رہا تھا اور مجھے اس کی بدصورتی میں بھی ایک طرح کی خوبصورتی نظر آئی جسے میں نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔۔۔ سانپ عین اس جگہ پر تھا جہاں نوید کھڑی ہوا کرتی ہے۔ مجھے ایک الجھن نے گرفت میں لے لیا ایسا تو نہیں کہ نوید نے یہ سانپ پالا ہوا ہو جیسا کہ اساطیر میں کہیں درج ہے، ایک مخصوص عرصے کے بعد سانپ کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سانپ سے انسانی روپ میں ڈھل جانے والے لوگوں کی آنکھوں میں ایک جنونانہ شدت ہوتی ہے۔ اور وہ آنکھیں بھی نہیں جھپکتے۔ مجھے نوید کی آنکھوں میں ایک شدت تو نظر آ رہی تھی لیکن میں اس کی پلکوں کو جھپکتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔(۱۷)

خالد فتح محمد کا ناول لایعشق بلا خیز کی کہانی دو نوجوان دلوں کی جذباتی وابستگی سے شروع ہونیوالی کہانی ہے لیکن کہانی کار پوری فنی چابک دستی سے دو کرداروں کو دو ثقافتوں کا امین بنا کر کہانی کو زمان و مکاں کے ایک خاص دائرے میں لے جاتا ہے۔ یہ ناول دو تہذیبوں کے ساتھ ساتھ دو نسلوں کی کہانی بھی بن کر سامنے آتا ہے۔ ایک نسل وہ ہے جو

ہجرت میں اپنا تہذیبی اثاثہ بھی قیمتی سامان کی طرح محفوظ رکھے ہوئے ہیں جبکہ قیام پاکستان کے فوراً بعد والی نسل اس تہذیبی تنوع کو نا صرف قبول کر چکی ہوتی ہے بلکہ ایک دوسرے کے کلچرز میں رومانویت بھی محسوس کرتی ہے۔کہانی کا اختتام پر نوید اور وصی کا ملنا ایک تیسری تہذیبی جہت کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں انسان ذات پات اور رنگ ونسل سے ماورا ہو کر محبت کی تہذیب کو جنم دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد فتح محمد، اے عشق بلا خیز، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۴۵

۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۴۔ ایضاً، ص ۱۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۸

۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰